مولانا شیخ الاسلام ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ

محمد رمضان یوسف سلفی

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ برصغیر پاک وہند کی جامع الصفات علمی شخصیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے پناہ خوبیوں اور محاسن سے نواز رکھا تھا۔ وہ دین کے داعی بھی تھے اور مفسر قرآن بھی' متکلم بھی تھے اور مصنف بھی' مناظر بھی تھے اور صحافی بھی۔ ان کی اسلامی اور مسلکی خدمات کا دائرہ اس خطہ ارض میں دور دور تک پھیلا دکھائی دیتا ہے۔ ان کا شمار بیسویں صدی عیسوی کے ان علمائے کرام میں ہوتا ہے' جو متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ انہوں نے اس دور میں شعور کی آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا' جب اس خطے میں کئی اسلام دشمن تحریکیں پیدا ہو چکی تھیں اور اسلام پر پوری شدت سے حملہ آور تھیں۔

مولانا مرحوم نے ان حالات میں تعلیم وتربیت کی منزلیں طے کیں' مختلف مذاہب کی کتب کا مطالعہ کر کے ان سے متعلق معلومات حاصل کیں اور گردوپیش کا جائزہ لے کر وہ ان سب کے خلاف سینہ سپر ہو گئے اور اسلام کی مدافعت ومحافظت میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں۔

مولانا ابوعلی اثری نے لکھا ہے کہ مولانا ثناء اللہ جامع الصفات تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت بہت سے فضائل اور محاسن ان میں جمع کر دیے تھے۔ انہوں نے اپنی تمام حیثیتوں سے مذہب اہل حدیث اور اس سے کہیں زیادہ اسلام کو فائدہ پہنچایا اور اپنے واحد اہل حدیث اخبار کے ذریعے تحریک اہل حدیث کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ یہ تحریک اہل حدیث کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان جیسا باہمت' وسیع المعلومات' وسیع النظر' وسیع المطالعہ عالم اس کو مل گیا۔ جس نے اپنی تصنیفات' رسائل' مضامین اور تحریروں سے تحریک اہل حدیث میں ایسی زبردست انرجی اور طاقت بھر دی کہ ہندوستان میں بڑے بڑے مذاہب کے نظامات اس کی ٹکر سے ہل گئے۔

انہوں نے سید صاحب کے خیالات کے مطابق رفع الیدین اور آمین بالجہر وغیرہ پر بھی رسالے لکھے اور قادیانیوں اور آریوں کے رد میں بھی کتابیں لکھیں اور ان کے علماء اور پنڈتوں سے کھلے جلسوں میں مناظرے بھی کیے۔ جن کا زہر بڑی تیزی کے ساتھ نہ صرف پنجاب' بلکہ پورے ملک میں پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ یہ ان کی اتنی بڑی مذہبی خدمات ہیں' کہ اس پر مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ پھر ان اہم دینی خدمات کے ساتھ انہوں نے فروعی مسائل یعنی رفع یدین اور آمین بالجہر وغیرہ پر رسائل اور کتابیں لکھ کر خوب خوب داد تحقیق دی ہے اور نہایت قوی دلائل سے ان کی موید حدیثوں کو مرجع ہونا ثابت کیا ہے۔ یہ بھی ایک بڑی اہم دینی خدمت تھی' جو ان سے عمل میں آئی۔ اگر انہوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی ہوتی ان موضوعات پر اردو میں کتابیں نہ لکھتے تو بے چارے اردو دان جو اس مسلک پر چلنے اپنی سعادت سمجھتے تھے' اپنی تشنگی کہاں جا کر بجھاتے' کوئی تو سرچشمہ ان کے لیے چاہئے تھا۔ مقلدین کے لیے تو دیوبند تھا' سہارن پور تھا' دہلی تھا' مراد آباد تھا اور پھر ان میں سے ایک طبقہ کے لیے بدایوں تھا' بریلی تھا' فرنگی محل تھا۔ لیکن سلف کے نقش قدم پر چلنے والوں کا مامن ومحکا کہاں تھا' یہ کس دیوار سے جا کر اپنا سر ٹکراتے۔

مولانا ثناء اللہ ان مرفوع' قوی اور مرجع حدیثوں پر عمل کرنے والوں کے لیے درحقیقت آیۃ من آیات اللہ تھے۔ ان کی بدولت آنحضرت ﷺ کی کتنی متروک سنتوں پر عمل ہوا اور وہ سنتیں کتنے لوگوں کا مستقل مسلک بن گئیں۔ یہ وہی ہیں' جو اپنے کو اہل حدیث' عامل بالحدیث' سلفی' موحد' محمدی اور اغیار ان کو غیر مقلد اور وہابی کہتے ہیں اور بحمد اللہ برصغیر کے دونوں ٹکڑوں یعنی ہندوستان اور پاکستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ (چند رجال اہل حدیث صفحہ ۵۲'۵۳)

اب آیئے مولانا ثناء اللہ رحمۃ اللہ کے اوصاف گوناگوں اور دینی خدمات کی ایک اجمالی سی جھلک دیکھنے کی کوشش کریں۔ مولانا ثناء اللہ کے آباؤ اجداد اصلاً کشمیر کے رہنے والے تھے اور کشمیریوں کے منٹو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کا نام ''خضر جو'' اور تایا کا اسم گرامی ''اکرم جو'' تھا۔

یہ لوگ علاقہ ڈور کے رہنے والے تھے' جو تحصیل اسلام آباد ضلع سری نگر میں واقع ہے۔ کشمیر کے زیادہ تر لوگ پشمینے کی تجارت کا کام کرتے تھے۔ مولانا مرحوم کے والد اور تایا کا بھی یہی کاروبار تھا۔ یہ لوگ ۱۸۶۰ء میں تجارت کی غرض سے یا کشمیر کے ڈوگرا حکمران رانا رنبیر سنگھ کی ستم رانیوں سے تنگ آ کر امرتسر میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر پر انگریز کی حکمرانی تھی اور یہ خطہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ (سیرت ثنائی)

مولانا ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت جون ۱۸۶۸ء (بمطابق ۱۲۸۷ھ) کو امرتسر میں ہوئی۔ عمر عزیز کی ابھی سات بہاریں ہی دیکھ پائے تھے کہ ان کے والد محترم اس دنیا سے منہ موڑ کر آخرت کو روانہ ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کے تایا ''اکرم جو'' بھی سفر آخرت اختیار کر گئے۔ یہ وقت مولانا مرحوم کے لیے نہایت رنج والم اور ابتلا کا تھا۔ ساتھ ہی عسرت وتنگدستی کے سائے بھی چھائے ہوئے تھے۔ ان کے بڑے بھائی ابراہیم رفوگری کا کام کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھی یہ کام

سکھا دیا اور دونوں بھائی یہ کام کر کے رزق حلال کمانے لگے۔

مولانا مرحوم کی عمر ۱۴ سال تھی کہ ان کی پیاری والدہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔ انہی دنوں ایک بزرگ ان کے پاس اپنا چوغہ رفو کروانے کے لیے لے کر آئے۔ انہوں نے مولانا مرحوم سے چند باتیں دینی موضوع سے متعلق کیں اور مولانا نے ان کے بڑے اچھے جوابات دیئے۔ اس بزرگ نے مولانا کی ذہانت وفطانت اور خداداد صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انہیں دینی تعلیم کے حصول کا مشورہ دیا۔ اس وقت مولانا مرحوم کی عمر چودہ سال تھی۔ اسی عمر میں ان کے دل میں دینی تعلیم کے حصول کا جذبہ ابھرا۔ اس وقت امرتسر میں مولانا احمد اللہ امرتسری (متوفی ۱۹۱۶ء) کا سلسلہ درس جاری تھا' جن کا شمار امرتسر کے رؤساء میں ہوتا تھا۔

مولانا ثناء اللہ مرحوم نے ان کے حلقہ درس میں رہ کر کتبِ درسیہ میں سے علم نحو کی شرح جامی اور علم منطق کی قطبی تک کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد کتب حدیث کی تحصیل کے لیے گوجرانوالہ کے شہر وزیر آباد کا رخ کیا۔ اس دور میں صوبہ پنجاب کے اس چھوٹے سے شہر کو علم حدیث کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ اس بلدہ علم میں استاد پنجاب حضرت مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ فروکش تھے اور انہوں نے مسند حدیث آراستہ کر رکھی تھی۔ حافظ صاحب آنکھوں سے نابینا اور دل کے بینا تھے۔ ان کی علمی بصیرت بہت تیز تھی۔ وہ بہت بڑے عالمِ حدیث اور فنِ رجال کے ماہر تھے۔

متحدہ پنجاب میں جن علمائے کرام کی مساعی جمیلہ سے علمِ حدیث کی شمع روشن ہوئی اور قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صدائیں گونجیں' ان میں حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کا اسم گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہے۔ اس عظیم المرتبت استاذ حدیث کی خدمت میں حاضر ہو کر مولانا ثناء اللہ صاحب نے کتب احادیث اور دیگر مروجہ دینی علوم وفنون کی تحصیل کی اور ۱۸۸۹ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔

حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے صحیحین پڑھنے کی خاطر بلدہ علم دہلی کی طرف شدرحال کیا۔ یہ وہ دور تھا جب دہلی میں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا حلقہ درس وتدریس بامِ عروج پر تھا۔ اب مولانا مرحوم ان کی بارگاہِ فضیلت میں حاضر ہوئے اور حضرت میاں صاحب سے خوب استفادہ کیا۔ ان کی خدمت میں اپنے استادِ گرامی حافظ عبدالمنان کی طرف سے حاصل کردہ سند پیش کر کے ان سے شرف اجازہ کی سعادت حاصل کی۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا' جو انہیں حضرت میاں صاحب کی طرف سے عطا ہوا۔

یہاں سے علمی وعملی طور پر بہرہ مند ہونے کے بعد مولانا مرحوم سہارن پور گئے اور کچھ عرصہ وہاں مدرسہ مظاہر العلوم میں قیام پذیر ہو کر دینی علوم سے مستفید ہونے کی سعادت حاصل کی۔ حصولِ علم کے لیے سہارن پور سے دیوبند آئے۔ ان دنوں دارالعلوم دیوبند کی مسندِ تدریس پر مولانا محمود حسن فائز تھے۔ مولانا ثناء اللہ مرحوم باقاعدہ ان کے حلقہ شاگردی میں شامل ہوئے اور ان سے منقولات و معقولات سے متعلق کتب درسیہ کی تکمیل کی اور دورہ حدیث میں بھی شریک ہوئے۔ یہاں انہوں نے حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی اور دارالعلوم دیوبند کے درس حدیث میں جو فرق تھا' اسے خوب سمجھا اور درس وتدریس کے یہ دونوں مراکز جن خطوط پر چل رہے تھے اس سے خوب استفادہ کیا۔ دیوبند کی سند فراغ کو مولانا مرحوم اپنے لیے باعث افتخار قرار دیتے تھے۔ (بزم ارجمنداں از مولانا اسحاق بھٹی)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مولانا کی دیوبند میں تعلیم کا ایک مسرت آمیز واقعہ نقل کر دیا جائے۔ مولانا فضل الرحمٰن بن محمد الازہری لکھتے ہیں چونکہ مولانا ثناء اللہ کی طبیعت میں قدرتی تجسس وتحقیق کا رجحان پایا جاتا تھا' لہٰذا دیوبند میں دورانِ تعلیم مولانا (ثناء اللہ) شیخ الہند سے دلیرانہ اور بے باکانہ سوالات کیا کرتے تھے۔ ان سوالات سے مقصود وسعتِ معلومات کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ اس لیے ان کے استادِ محترم بڑی محبت وشفقت' نرمی اور تسلی سے ان کے سوالات کا جواب دیا کرتے تھے۔ مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد رخصت کی اجازت لینے اور الوداعی ملاقات کے سلسلے میں شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوئے تو استادِ محترم نے انتہائی مسرت اور اطمینان کے ساتھ فرمایا "ثناء اللہ! طلبہ تمہاری بہت سی شکایتیں کیا کرتے تھے کہ یہ اعتراضوں میں بہت سا وقت ضائع کرتا ہے' لیکن تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ جسے اللہ تعالیٰ کچھ عطا فرماتا ہے' اسی سے حسد بھی کیا جاتا ہے۔" مولانا ثناء اللہ نے جب اپنے استادِ محترم کی زبان سے یہ کلمات سنے تو ان کی آنکھیں فرطِ مسرت سے آبدیدہ ہو گئیں اور ان کی زبان سے یہ شعر جاری ہو گیا

دیدہ ام در غنچگی چندیں جفائے باغباں
بعد گل گشتن نمیدانم چہ گل خواہد شگفت

مولانا ثناء اللہ فرماتے تھے کہ یہ واقعہ ایسا مسرت آمیز تھا کہ ساری عمر میں کسی بھی حالت میں نہ بھولا۔ جب بھی معاصرین کے نرغے میں دل تنگ ہوتا تو اس واقعہ کی یاد کو فوراً تازہ کر کے دل کو شاد کر لیتا۔

(حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری۔ صفحہ: ۳۶'۳۷)

دارالعلوم دیوبند سے سندِ فراغ حاصل کرنے کے بعد مولانا ثناء اللہ مدرسہ فیضِ عام کانپور پہنچے۔ ان دنوں مولانا احمد حسن مرحوم کے درس کا شہرہ بہت زیادہ تھا۔ ان دنوں انہیں حدیث پڑھانے کا تازہ تازہ شوق ہوا تھا۔ مولانا محترم حدیث کے ساتھ ساتھ علوم معقول ومنقول میں بھی خاص شغف رکھتے تھے۔ لہٰذا وہ خوشی خوشی مدرسہ فیضِ عام کانپور میں داخل ہوئے۔

مولانا ثناء اللہ اپنے خودنوشت حالات میں بیان

کرتے ہیں کہ.......... وہاں جا کر میں کتب مقررہ میں شریک ہوا اور قند مکرر کا لطف پایا۔ انہی دنوں مولانا احمد حسن مرحوم کو حدیث پڑھانے کا تازہ تازہ شوق ہوا تھا۔ میں ان کے درسِ حدیث میں شریک ہوا۔ پنجاب میں مولانا حافظ عبدالمنان صاحب مرحوم (اہل حدیث مشرب) میرے شیخ الحدیث تھے۔ دیوبند میں مولانا محمود الحسن صاحب اور کانپور میں مولانا احمد حسن صاحب (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) استاذ العلوم والحدیث میرے شیخ الحدیث تھے۔ اس لیے میں نے حدیث کے تینوں استادوں سے جو طریقہ تعلیم سیکھا وہ بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہے' جس کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ ۱۳۱۰ھ بمطابق ۱۸۹۲ء فیض عام کانپور کا جلسہ ہوا۔ جس میں آٹھ طلبہ کو دستارِ فضیلت اور سندِ تکمیل دی گئی۔ ان آٹھ میں سے ایک میں گمنام بھی تھا۔

(اہل حدیث کا مذہب طبع مکتبہ ثنائیہ سرگودھا)

یہاں ایک عجیب اتفاق بھی ملاحظہ فرمائیں کہ جس موقع پر مولانا ثناء اللہ امرتسری اور ان کے ساتھیوں کی دستار بندی ہوئی اور ان کو سندیں دی گئیں تھیں' اسی مجلس میں ندوۃ العلماء لکھنو کی بنیاد رکھی گئی تھی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کی ذہانت و فطانت اور علمی استعداد کو دیکھتے ہوئے انہیں ندوۃ العلماء کا رکن بنایا گیا تھا۔ اس مجلس میں ندوہ کے تاسیسی ارکان میں یہ سب سے کم عمر تھے۔

۱۸۹۲ء میں مولانا ثناء اللہ امرتسری فارغ التحصیل ہو کر اپنے وطن امرتسر تشریف لائے۔ ان کے پہلے استاد مولانا احمد اللہ رئیس امرتسر کا مدرسہ تائید اسلام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا مرکز تصور کیا جاتا تھا اور یہاں بچوں کی تعلیم کے لیے تدریس کا کام احسن طریقے سے چل رہا تھا۔ مولانا احمد اللہ کو اپنے اس شاگرد رشید کی علمی لیاقت' وسعت معلومات' وسیع المطالعہ اور رسوخ علم کا پتہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے مولانا کی خدمات اپنے مدرسہ تائیدالاسلام کیلئے حاصل کر لیں۔

ہمارے دوست ملک عبدالرشید عراقی صاحب کی تحقیق کے مطابق مولانا ثناء اللہ امرتسری ۶ سال تک یہاں پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد دو سال انہوں نے مالیر کوٹلہ کے مدرسہ اسلامیہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے تدریسی خدمات سرانجام دیں اور آخر اسے چھوڑ کر واپس امرتسر آ گئے۔ (چالیس علمائے اہل حدیث' صفحہ:۱۸۱)

بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ مناظروں اور مباحثوں کا زمانہ تھا۔ مختلف مذاہب کے اصحاب علم اپنے اپنے مذہب کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے ایک دوسرے کو مناظرے کا چیلنج دیتے رہتے تھے۔ مناظروں میں حریف کے علم و فضل کا بہت بڑا معیار سرکاری سند کو سمجھا جاتا تھا اور اس دور میں کسی عالم دین کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا اور اس سے علمی میدان میں آگے بڑھنے کے مواقع ملتے اور نئی راہیں کھلتی تھیں۔ علوم شرقیہ میں مولوی فاضل کا امتحان خاص اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ مولانا ثناء اللہ صاحب نے ۱۹۰۲ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے اس کی سند حاصل کی۔

(بزم ارجمنداں از مولانا اسحاق بھٹی۔ صفحہ:۱۴۷)

جیسا کہ گذشتہ سطور میں بتایا گیا کہ تحصیل علم کے بعد مولانا کو منصب تدریس پر متمکن ہونے کے مواقع میسر آئے' مگر انہوں نے عملی طور پر اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مختلف اطراف سے اسلام اور پیغمبر اسلام پر شدید حملے ہو رہے تھے۔ عیسائی پادریوں اور آریہ سماجی پرچارکوں نے ایک خاص منصوبے کے تحت منظم طریقے سے اسلام اور اسلامی تہذیب و تعلیمات پر یلغار کر دی تھی۔ علاوہ ازیں فتنہ مرزائیت بھی ابھر آیا تھا۔

ان وجوہ کی بنا پر مولانا ثناء اللہ کے نزدیک یہ وقت مسجد میں بیٹھ کر خدمت دین سرانجام دینے کا نہ تھا بلکہ میدان میں اتر کر براہِ راست ان غلط طاقتوں سے نبرد آزما ہونے کا تھا۔ اس وقت مولانا محمد حسین بٹالوی رحمۃ اللہ علیہ اس محاذ کے علم بردار تھے اور تنہا مخالفین اسلام کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے۔ مولانا ثناء اللہ مرحوم نے اسی مورچے میں آنے کو ترجیح دی۔ وہ خود فرماتے ہیں کانپور سے فارغ ہوتے ہی میں اپنے وطن پنجاب پہنچا اور مدرسہ تائیدالاسلام امرتسر میں کتب درس نظامیہ کی تعلیم پر مامور ہوا۔ طبیعت میں تجسس زیادہ تھا' اس لیے ادھر سے ماحول کی مذہبی حالت دریافت کرنے میں مشغول رہتا۔

میں نے دیکھا کہ اسلام کے سخت بلکہ سخت ترین مخالف عیسائی اور آریہ دو گروہ ہیں' ان ہی دنوں قریب میں قادیانی تحریک پیدا ہو چکی تھی۔ جس کا شہرہ ملک میں پھیل چکا تھا۔

مسلمانوں کی طرف سے اس دفاع کے علم بردار مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی مرحوم تھے۔ میری طبیعت طالب علمی ہی کے زمانے میں مناظرات کی طرف بہت زیادہ راغب تھی' اس لیے تدریس کے علاوہ میں ان تینوں گروہوں (عیسائی' آریہ' قادیانیوں) کے علم کلام اور کتب مذہبی کی طرف متوجہ رہا۔ بفضلہ تعالیٰ میں نے اس میں کافی واقفیت حاصل کر لی۔ ہاں! اس میں شک نہیں کہ ان تینوں مخاطبوں سے قادیانی مخاطب کا نمبر اول رہا۔ شاید اس لیے کہ قدرت کو منظور تھا کہ مولانا بٹالوی مرحوم کے بعد یہ خدمت میرے سپرد ہو گی' جن کی جانب مولانا مرحوم کو علم ہوا ہو تو شاید یہ شعر پڑھتے ہوں گے

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
رہی خالی نہ کوئی دشت میں جا میرے بعد

اس شغل میں میں نے چند علمائے سلف کی تصنیفات سے خاص فوائد حاصل کیے۔ حدیث شریف میں قاضی شوکانی' حافظ ابن حجر اور ابن قیم وغیرھم کی تصانیف سے' علم کلام میں امام بیہقی' امام غزالی' حافظ ابن حزم' علامہ عبدالکریم شہرستانی' حافظ ابن تیمیہ' شاہ ولی اللہ اور امام رازی وغیرھم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی تصانیف سے فائدہ اٹھایا۔ (اہل حدیث کا مذہب طبع مکتبہ ثنائیہ سرگودھا)

مولانا ثناء اللہ امرتسری کی علمی و تصنیفی خدمات کا جائزہ لیں تو یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ آپ نے

تحصیل علم کے فوری بعد تصنیف وتالیف کا کام شروع کر دیا تھا اور ۱۸۹۵ء میں تفسیر ثنائی کی جلد اول لکھ کر شائع کر دی تھی۔ ادیان باطلہ کے رد میں آپ نے ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ لکھنا شروع کیا۔ آپ کا مطالعہ وسیع اور اسلامی علوم و فنون پر گہری نظر تھی۔ حدیث، تفسیر، منطق، فلسفہ اور علم الکلام میں انہیں کامل دستگاہ تھی۔ جس موضوع پر گفتگو فرماتے، علم کے لؤ لؤ ولالہ بکھیرتے چلے جاتے اور جس عنوان پر قلم کو جنبش دیتے، علم وتحقیق کے موتی پرو کے رکھ دیتے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر لکھا اور خوب لکھا۔

آریہ سماج، عیسائیت اور فتنہ قادیانیت ان کی توجہ کا خاص مرکز رہے اور انہوں نے ان باطل فرقوں کے خلاف تحریری، تصنیفی اور مناظرہ ومباحثہ کے ذریعے قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ مولانا ثناء اللہ مرحوم سادہ اور عام فہم اسلوب میں لکھتے تھے اور اپنے ماضی الضمیر کا اظہار نہایت خوبصورتی سے کرتے تھے۔ ان کی تحریروں میں علم و تحقیق کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی چاشنی بھی پائی جاتی تھی۔ بلاشبہ وہ اس خطہ ارض کے بلند پایہ مصنف، خطیب اور مناظر تھے۔ ہمارے بزرگ دوست اور جماعت اہل حدیث کے عظیم مصنف محترم ملک عبدالرشید عراقی صاحب کی تحقیق کے مطابق حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کی تعداد ۱۸۹ تک پہنچتی ہے اور اس میں اگر محترم مولانا سعید چنیوٹی صاحب کے مرتب کردہ سفرنامہ حجاز ثناء اللہ امرتسری کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل کتب ۱۹۰ ہو جاتی ہیں۔ (چالیس علمائے اہل حدیث)

آئندہ سطور میں مولانا مرحوم کی معروف تصانیف کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے تفسیر قرآن، خدمات قرآن کے حوالے سے آپ نے چار تفاسیر لکھیں۔

(۱) تفسیر ثنائی:

یہ تفسیر آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تکمیل میں ۳۶ سال کا عرصہ لگا۔ پہلی جلد ۱۸۹۵ء میں طبع ہوئی اور آخری جلد ۱۹۳۱ء میں۔

قرآن مجید کی یہ مختصر اور جامع تفسیر ہے۔ مولانا محترم نے اردو ترجمہ کرتے وقت ایک آیت کا ربط دوسری آیت سے قائم کرنے کی سعی کی ہے اور مناظرانہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے اسلام دشمن عناصر اور سرسید کے بعض افکار ونظریات پر تنقید کرتے ہوئے ان کے مدلل جوابات دیئے ہیں۔ یہ تفسیر اپنے دامن میں ندرت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس کے شروع میں مولانا مرحوم نے مقدمہ تفسیر میں سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی نبوت کو عقلی ونقلی دلائل سے اس طرح پیش کیا ہے کہ ذرا سی ہوش وخرد رکھنے والا اسے پڑھ کر فوراً آپ ﷺ کی نبوت کا قائل ہو جائے۔ یہ تفسیر کئی بار شائع ہو چکی ہے۔

(۲) تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن:

یہ تفسیر عربی زبان میں ہے اور ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ مولانا مرحوم نے ایک آیت کی تشریح وترجمہ کے لیے دوسری آیت سے مدد لی ہے، یعنی قرآن کی تفسیر قرآن سے ہی کی گئی ہے۔ اکابر علمائے کرام اور عرب دنیا نے اس تفسیر کی بڑی تحسین کی اور مولانا کے حسن کلام اور اسلوب بیان کو سراہتے ہوئے انہیں قدر ومنزلت سے نوازا ہے۔

(۳) بیان الفرقان علی علم البیان:

یہ تفسیر صرف سورۃ بقرہ تک ہے اور عربی زبان میں لکھی گئی۔ اس میں فصاحت وبلاغت کے ذریعے قرآن کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ تفسیر فن بیان ومعانی کا ایک نمونہ ہے، افسوس مکمل نہ ہو سکی۔

تفسیر بالرائے

اس تفسیر میں مولانا نے تفسیر بالرائے پر اصولی و فنی نقطہ نگاہ سے بحث کی ہے اور اس کی روشنی میں بعض مفسرین کی ان اغلاط کی نشاندہی کی ہے جو اس موضوع سے متعلق کی گئی ہیں، اس میں قادیانی، چکڑالوی، بریلوی اور شیعہ حضرات کے مفسرین کے غلط استدلال کی اصلاح کرتے ہوئے بڑی اچھی اور عمدہ تحقیقی بحث کی ہے۔

ان مذکورہ تفاسیر کے علاوہ اس موضوع پر مولانا موصوف نے جو کتب تصنیف کیں، ان کے نام یہ ہیں۔ آیات متشابہات، برہان التفاسیر بجواب سلطان التفاسیر، الہامی کتب، القرآن العظیم، الہام، کتاب الرحمان، حق پرکاش وغیرہ۔ (مولانا ثناء اللہ امرتسری مختصر حالات اور تفسیری خدمات صفحہ ۶۰، از عبدالمبین ندوی)

عیسائیت کے رد میں کتب

برصغیر میں جب انگریز کا تسلط ہوا تو عیسائی مشنری بھی سرگرم ہو گئی اور انہوں نے عیسائیت کی ترویج و اشاعت کیلئے لوگوں میں تبلیغ کرنا شروع کر دی اور بعض عیسائی مصنفوں نے دین اسلام کو بھی ہدف تنقید ٹھہرایا اور کتب تصنیف کیں۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ نے ان کتب کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا اور انہوں نے اسلام کے دفاع اور عیسائیت کے رد میں بڑی تحقیقی کتب لکھیں۔ عیسائیت کے ردّ میں لکھی گئی ان کی مشہور کتب یہ ہیں:

تقابلِ ثلاثہ

یہ کتاب مولانا مرحوم کی مشہور اور بلند پایہ تصنیف ہے۔ اسے انہوں نے پادری ٹھاکر دت کی کتاب ''عدم ضرورت قرآن'' کے جواب میں حوالہ قرطاس کیا تھا۔ مولانا نے اس کتاب میں ﴿قرآناً عربیاً غیر ذی عوجا﴾ کا تقابل توراۃ اور انجیل کے ساتھ آیت بہ آیت سامنے کیا ہے اور تینوں کتابوں کے الہامی مضامین اصل الفاظ میں دکھا کر قرآن حکیم کی برتری اور فضیلت ثابت کی ہے۔ یہ اپنے موضوع کی دلچسپ اور منفرد کتاب ہے۔ حال ہی میں راقم کی خواہش اور توجہ دلانے پر محترم ضیاء الحق نعمانی صاحب مالک نعمانی کتب خانہ لاہور نے اسے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۰۴ء میں طبع ہوئی تھی۔

توحید، تثلیث اور راہِ نجات

اس کتاب میں توحید، تثلیث اور راہِ نجات پر

محققانہ بحث کر کے عیسائیوں کے اعتراضات کا بڑا عمدہ جواب دیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۴ء میں طبع ہوئی۔

جواباتِ نصاریٰ

یہ کتاب مولانا کے ان رسائل و مضامین کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے عیسائی پادری عبدالحق اور پادری سلطان محمد پال کے جواب میں لکھے تھے۔ یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔

مناظرہ الٰہ آباد

یہ اس تحریری مناظرے کی روئداد ہے، جو مولانا ثناء اللہ اور پادری عبدالحق کے درمیان توحید و تثلیث کے مسئلہ پر ہوا تھا۔ اس مناظرے کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ پادری عبدالحق نے مولانا کے دلائل پر تنگ آ کر برملا کہہ دیا تھا کہ ''کون کمبخت الوہیت مسیح کا قائل ہے۔''

اسلام اور مسیحیت

یہ کتاب عیسائیوں کی تین کتب توضیح البیان فی اصول القرآن، مسیحیت کی عالم گیری اور دین فطرت اسلام ہے یا مسیحیت کا نہایت عالمانہ و فاضلانہ تحقیقی جواب ہے۔ عیسائیوں کی طرف سے یہ اسلام پر بہت بڑا حملہ تھا، جس کا مولانا نے اپنی علمی صلاحیتوں سے خوبصورتی سے دفاع کیا۔ اسلام اور مسیحیت کی ابتداء میں مولانا لکھتے ہیں کہ میں اپنے دلی خیال کا اظہار کرتا ہوں کہ اپنی جملہ تصانیف میں سے دو کتابوں کی نسبت مجھے زیادہ یقین ہے کہ خدا ان کو میری نجات کا ذریعہ بنائے گا۔ ان میں سے ایک کتاب مقدس رسول ہے جو رنگیلا رسول کے جواب میں ہے۔ دوسری کتاب یہی اسلام اور مسیحیت ہے۔ پہلی کتاب میں میں نے بتوفیقہ تعالیٰ ذات رسالت مآب ﷺ کا دفاع کیا ہے اور دوسری میں اسلام اور قرآن مجید سے مدافعت کی ہے۔ اس لیے میں کہہ سکتا ہوں

روز قیامت ہر کسے در دست گیرد نامہ
من نیز حاضر مے شوم تائید قرآن در بغل

تفسیر سورۂ یوسف اور تحریفات بائیبل

اس کتاب میں دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ عیسائی پادریوں نے ہر دور میں بائیبل میں تحریفات کی ہیں۔ مولانا نے اس کا ثبوت بائیبل کے مختلف ایڈیشنوں سے دیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۴ء میں طبع ہوئی۔ (ماخوذ تذکرہ ابوالوفا از عبدالرشید عراقی)

آریہ کے جواب میں لکھی گئی کتب

یہود و نصاریٰ کی طرح ہندو بھی شروع دن سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے درپے آزار رہے ہیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ پہلے بھی وہ اسلام کے خلاف زبان و قلم سے وار کرتے تھے اور اب بھی وہ اپنے خبثِ باطن کا اظہار کرنے سے نہیں چوکتے۔ جن دنوں مولانا ثناء اللہ امرتسری عیسائیوں، قادیانیوں اور دیگر مذاہب باطلہ کے خلاف علمی و قلمی میدان میں نبرد آزما تھے، ایسے میں آریہ سماج کے منہ پھٹ مصنفوں نے اسلام، پیغمبر اسلام اور قرآن سے متعلق زبان و قلم سے حملے کرنا شروع کیے۔

مولانا خم ٹھوک کر ان کے سامنے آ گئے اور انہوں نے آریہ دھرمیوں کو دندان شکن جواب دے کر ان کی بولتی بند کر دی۔ آریہ کے رد میں مولانا محترم نے بڑی وقیع تصنیفی خدمات سرانجام دی۔ اس سے ان کی اسلامی غیرت و حمیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا کے پیش نگاہ اسلام کا دفاع اور پیغمبر اعظم حضرت محمد ﷺ کی عزت و ناموس کی حفاظت تھا۔

حق پرکاش

یہ کتاب سوامی دیانند سرسوتی کی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' کے ۱۴ویں باب کا جواب ہے۔ جس میں سوامی جی نے قرآن مجید پر ۱۵۹ اعتراضات کیے ہیں۔ مولانا محترم نے ان اعتراضات کے نہایت عالمانہ جواب دے کر جہاں اسلامی تعلیمات کو اجاگر کیا ہے، وہیں سوامی جی کی غلط بیانیوں اور اسلامی تعلیم سے عدم واقفیت کی بھی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۰۰ء میں طبع ہوئی۔

کتاب الرحمان

اس کتاب میں پنڈت دھرم بھکشو کی کتاب بنام کتاب اللہ وید ہے یا قرآن کا مسکت جواب دیا گیا ہے۔

تُرکِ اسلام

غازی محمود دھرم پال بیسویں صدی کی ابتداء میں برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم نام تھا۔ وہ ۱۹۰۳ء میں آریہ سماج میں چلے گئے تھے اور انہوں نے ایک زہریلی کتاب ''ترک اسلام'' لکھی۔ اس سے مسلم حلقوں میں بے چینی سی پائی جانے لگی۔ مولانا ثناء اللہ مرحوم نے اس کا جواب ''تُرکِ اسلام'' (اسلام کا سپاہی) دیا۔ اسے پڑھ کر مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور دھرم پال نے بھی مولانا کے جوابات کی معقولیت کا اعتراف کیا۔ دھرم پال کے دوبارہ مشرف بہ اسلام ہونے میں کسی حد تک اس کتاب کا بھی عمل دخل ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں ''میں سکول میں چھٹے درجے کا طالب علم تھا اور عمر گیارہ سال سے زائد نہ تھی۔ ایک ہندو لڑکے سے لے کر ترک اسلام کی جھلک دیکھ لی تھی اور اس پر تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی، کچھ ہی دن بعد تُرکِ اسلام کی زیارت نصیب ہو گئی اور اس نے زخم پر ٹھنڈا مرہم رکھ دیا۔'' (معاصرین: ۱۴۴) یہ کتاب ۱۹۰۳ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔

مقدسِ رسول ﷺ

یہ کتاب ایک گمنام آریہ کے بدنام زمانہ رسالہ ''رنگیلا رسول'' کا بہت ہی خوبصورت جواب ہے۔ جس میں بڑی متانت اور سنجیدگی سے رنگیلے مہاشہ کی دشنام طرازیوں کو طشت از بام کر کے رسول پاک ﷺ کی پاکیزہ زندگی کے گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق مفتی کفایت اللہ دہلوی مرحوم نے لکھا تھا کہ ''مولانا ثناء اللہ صاحب نے یہ رسالہ لکھ کر مسلمانوں پر احسان عظیم کیا ہے اور اخبار وکیل امرتسر نے ۶ ستمبر ۱۹۲۴ء کو اپنی اشاعت میں

لکھا تھا کہ جس قدر رنگیلا رسول اشتعال انگیز، فحش اور دائرہ تہذیب سے خارج ہے اسی قدر مقدس رسول صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی تحمل، متانت اور شائستگی کو لیے ہوئے ہے۔ مولانا ثناء اللہ مرحوم بھی اس رسالے کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھنے لگے۔" (تذکرہ ابوالوفاء:۸۹)

ردِّ قادیانیت

مرزائیت نے جب اس خطے میں اپنے زہریلے اثرات پھیلانے شروع کیے تو علمائے اہل حدیث نے فوری اس کا سدباب کیا۔ مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کے استفتاء پر شیخ الکل سید نذیر حسین محدث دہلوی نے مرزا قادیانی پر سب سے پہلا فتویٰ تکفیر جاری کیا اور پھر اس پر برصغیر کے نامور سینکڑوں علماء کے دستخط کروا کر مرزا قادیاں کے کفر پر مہر ثبت کر دی۔ (یہ فتویٰ مکتبہ سلفیہ لاہور کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔) مرزائیت کے رد میں جس مردِ حق آگاہ نے سب سے زیادہ مناظرے کیے، کتب تصنیف کیں اور مرزا غلام احمد کے چیلنج پر اس کے گھر جا کر اسے مناظرے کے لیے للکارا، اسے دنیا فاتح قادیان شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری کے نام سے جانتی ہے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم لکھتے ہیں کہ میری تصانیف جو قادیانیت کے متعلق ہیں، اس کی تفصیل لکھوں تو ناظرین کے ملال خاطر کا خطرہ ہے۔ اس لیے مختصر طور پر بتلاتا ہوں کہ قادیانی تحریک سے متعلق میری کتابیں اتنی ہیں کہ مجھے خود ان کا شمار نہیں۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس شخص کے پاس یہ کتابیں موجود ہوں، قادیانی مباحث میں اسے کافی واقفیت حاصل ہو سکتی ہے، جس کا ثبوت خود مرزا صاحب بانی تحریک قادیان کی اس تحریر سے ملتا ہے، جو انہوں نے ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء کو شائع کی تھی۔ جس کا عنوان تھا "مولوی ثناء اللہ کے ساتھ آخری فیصلہ۔"

اس کے شروع میں میری نسبت جو خاص گلہ و شکایت کی گئی ہے، وہ خصوصاً قابل دید و شنید ہے۔ مرزا صاحب نے لکھا ہے مولوی ثناء اللہ نے مجھے بدنام کیا، میرے قلعہ کو گرانا چاہا وغیرہ۔ اس لیے دعا کرتا ہوں کہ ہم دونوں میں جو جھوٹا ہے، وہ سچے کی زندگی میں مر جائے۔

کوئی خاص وقت تھا جب یہ دعا ان کے منہ اور قلم سے نکلی اور قبولیت اسے لینے آئی۔ آج قادیان کی بستی میں ادھر ادھر دیکھو تو رونق بہت پاؤ گے مگر ایسی کہ دیکھنے والا اہل قادیان کو مخاطب کر کے داغ مرحوم کا یہ شعر سنائے گا۔

آپ کی بزم میں سب کچھ ہے مگر داغ نہیں
ہم کو وہ خانہ خراب بہت یاد آیا

قادیانی لٹریچر کو جمع کرنے اور واقفیت حاصل کرنے میں میں نے بڑی محنت کی، جس کا اثر یہ ہوا کہ ایک مجلس میں مولانا حبیب الرحمن مرحوم مہتمم مدرسہ دیوبند نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ ہم لوگ ۳۰ سال تک محنت کریں تو بھی اس بارے میں آپ کی واقفیت کو نہیں پہنچ سکتے۔ میں نے کہا غالباً یہ آپ کا حسن ظن ہے۔

مولانا محترم نے قادیانیت کے ردّ میں جو کتب اور رسائل لکھے ہیں، ان میں چند ایک کے نام یہ ہیں تاریخ مرزا، فیصلہ مرزا، الہامات مرزا، نکاح مرزا، نکاتِ مرزا، عجائبات مرزا، علم کلام مرزا، شہادت مرزا، چیستان مرزا، محمد قادیانیؑ، بہاء اللہ اور مرزا، فاتح قادیان، فتح ربانی اور مباحثہ قادیانی، شاہ انگلستان اور مرزا قادیان، مکالمہ احمدیہ، صحیفہ محبوبیہ، تحفہ احمدیہ، بطش قدیر بر قادیانی تفسیر کبیر وغیرہ۔

قادیانیت کے رد میں مولانا ثناء اللہ مرحوم کی تمام کتب و رسائل مجلس ختم نبوت ملتان نے احتساب قادیانیت نامی کتاب کی جلد ۸ اور ۹ میں شائع کر دی ہیں۔

دیگر موضوعات پر کتب

علمائے احناف (بریلوی+دیوبندی) اور شیعہ حضرات سے بھی کبھی کبھار نوک جھونک ہو جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ فقہ اور فقیہ، علم الفقہ، تنقید تقلید، تقلید شخصی و سلفی، معقولات حنفیہ، حدیث نبویؐ اور تقلید شخصی، اہل حدیث کا مذہب، آمین، رفع الیدین، فاتحہ خلف الامام، فتوحات اہل حدیث، شمع توحید اور نور توحید وغیرہ۔

ان کتب کے علاوہ مولانا مرحوم نے یہ کتابیں بھی لکھیں۔ خصائل النبی، اتباع رسول، خلافت رسالت، خلافت محمدیہ، حیات مسنونہ، کلمہ طیبہ، قرآنی قاعدہ ثنائیہ، السلام علیکم، ہدایت الزوجین، شریعت و طریقت، رسوم اسلامیہ، اسلام اور برٹش لاء، الفوز العظیم، ادب المفرد، التعریفات النحویہ ثنائی پاکٹ بک اور اربعین ثنائیہ وغیرہ۔

صحافتی خدمات

مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ بلند پایہ صحافی، مبصر، نقاد اور ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے مختلف ادوار میں چار رسائل جاری کیے اور صحافتی دنیا میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔

سب سے پہلے انہوں نے ۱۳ نومبر ۱۹۰۳ء کو ہفت روزہ اہل حدیث جاری کیا۔ جو ہر جمعے کو باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا۔ مسلم اور غیر مسلم حلقوں میں اسے دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ اس رسالے کے موضوع تھے، عیسائی مشن، آریہ مشن، قادیانی مشن، شیعہ مشن، بریلوی مشن اور اس کے علاوہ مختلف مذاہب پر بحث ہوتی تھی اور ملکی و غیر ملکی اہم خبروں کو بھی ہلکا پھلکا تبصرہ کر کے شائع کیا جاتا تھا۔ رسالے کے بیشتر مضامین اور اداریہ مولانا خود لکھتے تھے جو اپنے موضوع پر بڑا جامع ہوتا۔

غرضیکہ رسالہ متنوع مضامین کا دلچسپ مجموعہ تھا۔ یکم اگست ۱۹۴۷ء کو اس کا آخری شمارہ شائع ہوا۔ اس لحاظ سے یہ رسالہ ۴۴ سال مطلع صحافت پر نمودار رہا۔ اس عرصے میں ایک بار گورنمنٹ نے اخبار اہل حدیث کی ضمانت طلب کی تو مولانا مرحوم نے اس کی جگہ "مخزن ثنائی" اور "گلدستہ ثنائی" کے نام سے شمارے شائع کیے۔ مئی ۱۹۰۸ء میں انہوں نے ایک رسالہ "مسلمان" جاری کیا، جو کچھ عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ جبکہ اس رسالہ "مرقع قادیانی" نکالا اس میں مرزائیت کے رد میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ مرزا قادیانی کی موت کے بعد ۱۹۰۸ء تک

جاری رہا۔ مولانا مرحوم نے ثنائی اخبارات کس جذبے سے جاری کیے تھے اور انہوں نے ان کے ذریعے کس طرح کی خدمت سرانجام دی' اس لیے مولانا ثناءاللہ مرحوم کے الفاظ میں ہی سن لیجئے وہ لکھتے ہیں

''جب مذہبی تبلیغ کی ضرورت روزمرہ بڑھتی نظر آئی اور تصنیف وتالیف کا کام ناکافی ثابت ہوا تو اخبار ''اہل حدیث'' جاری کیا گیا۔ جس میں ہر غلط خیال کی اصلاح کی جاتی ہے۔ ہر غیر مسلم کے حملہ کا جواب دیا جاتا ہے۔' (اخبار اہل حدیث ۲۳ جنوری' ۱۹۴۲ء)

یہ اخبار کیا ہے؟ مجمع البحرین ہے۔ یعنی دین ودنیا کا مجموعہ' جس میں ملکی' مذہبی' اخلاقی اور تاریخی مضامین کے علاوہ متفرق سوال و جواب' دینی فتاویٰ اور مخالفین کے اعتراضات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ غرضیکہ اخبار توحید وسنت کا حامی' شرک و بدعت کا دشمن' مخالفین کے سامنے ڈھال کا کام دینے والا اور دنیا بھر کی چیدہ چیدہ خبریں بتانے والا ہے۔ (عام اشتہارات متعلقہ اخبار اہل حدیث بحوالہ فتنہ قادیانیت اور مولانا ثناءاللہ امرتسری صفحہ ۴۳)

فتاویٰ ثنائیہ

مولانا ثناء اللہ مرحوم کو فقہ اور فقہی مسائل میں درک حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے اخبار اہل حدیث میں فقہ وفتاویٰ کے لیے مستقل صفحات مختص کر رکھے تھے۔ ان کے چوالیس سالہ فتاویٰ کا انتخاب ہندوستان کے معروف عالم دین مولانا داؤد راز رحمۃ اللہ علیہ (وفات دسمبر ۱۹۸۱ء) نے محنت شاقہ سے مرتب کر کے ۲ جلدوں میں ۱۹۵۴ء میں پہلی بار شائع کیا تھا۔ فتاویٰ ثنائیہ میں انسانی زندگی میں پیش آمدہ مسائل کو قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ مولانا ثناء اللہ مرحوم کا جواب مختصر اور جامع ہوتا تھا۔ وہ اختصار کے ساتھ مسئلے کی جزئیات تک بیان کر جاتے تھے۔ ان کے فتاویٰ پر مولانا شرف الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۱۹۶۱ء) نے بڑے مفید حواشی سپرد قلم کیے ہیں۔ اس سے ان فتاویٰ کی اہمیت وافادیت اور بھی دوچند ہوگئی ہے۔

پاکستان میں فتاویٰ ثنائیہ کو پہلی بار ۱۹۷۲ء کے لگ بھگ شہید ملت علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ء) نے اپنے اشاعتی ادارے ترجمان السنہ کی طرف سے شائع کیا تھا۔ ان کے بعد دوسری بار فتاویٰ کے اس مجموعہ کو ہمارے دوست مولانا اقبال صاحب نے مکتبہ ثنائیہ سرگودھا کی طرف سے شائع کیا۔

مناظرے

مولانا ثناءاللہ امرتسری ذہین وفطین' حاضر جواب اور برجستہ گو مناظر تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ برصغیر میں ان جیسا مناظر پیدا نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں مرزائیوں' عیسائیوں' آریوں' بریلویوں' حنفیوں اور شیعوں سے ایک ہزار سے اوپر کامیاب مناظرے کیے۔ آریہ کے خلاف ان کا مناظرہ دیوریا' مناظرہ نگینہ بجنور' مناظرہ جبلپور' مناظرہ گوشت خوری لاہور' مناظرہ ویلم مظفر نگر یوپی' مناظرہ خورجہ بلند شہر' مناظرہ حیدرآباد سندھ' مناظرہ دینا نگر ضلع گورداسپور وغیرہ۔

عیسائیوں سے مناظرہ لاہور ۱۹۱۰ء' مناظرہ ہوشیارپور ۱۹۱۶ء' مناظرہ گوجرانوالہ فروری ۱۹۲۶ء اور مناظرہ الہ آباد ۱۹۳۵ء وغیرہ۔

جبکہ شیعوں اور منکرین حدیث سے مناظرہ قادر آباد ضلع گجرات پنجاب اپریل ۱۹۴۱ء' مناظرہ لاہور ۱۹۲۰ء میں مسئلہ وراثت اور باغ فدک' منصور پور ضلع ہوشیارپور میں ۱۹۲۴ء میں مناظرہ خلافت اصحابہ ثلاثہ' ستمبر ۱۹۳۱ء میں بھی مناظرہ بھڑی شاہ رحمان وزیرآباد پنجاب' امرتسر میں مولوی خیر محمد جالندھری حنفی اور مولوی عبدالصمد سے لاہور میں مولوی حشمت علی' مولانا کرم دین سے فاتحہ خلف الامام' حاضر ناظر علم الغیب اور تقلید شخصی پر کامیاب مناظرے ہوئے۔ ان کے علاوہ بھی بیسیوں مناظرے احناف کے دیوبندی اور بریلوی علماء سے مختلف علاقوں میں ہوئے' جن میں مولانا کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ مناظرے اور بحثیں قادیانیوں کے خلاف ہوئیں۔

اس میدان میں مولانا مرحوم اس قدر پرجوش اور سرگرم تھے کہ وہ مرزا قادیانی کے چیلنج پر ۱۹۰۲ء میں قادیاں پہنچ گئے اور مرزے کو زچ کر دیا تھا۔ اسی باعث مولانا کو قوم نے فاتح قادیان کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

مولانا ثناءاللہ مناظرے میں خوب چہکتے تھے اور مخالف کو آڑھے ہاتھوں لیتے تھے۔ ان کے دلائل کی گرفت اس قدر مضبوط ہوتی کہ مخالف مناظر لمحوں میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوجاتا۔

اردو زبان وادب کے نامور ادیب ومصنف اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریاآبادی لکھتے ہیں ایک جگہ معروف نامور آریہ سماجی مناظر نے شروع ہی میں خم ٹھونک کر کہہ دیا کہ ''آپ مسلمان ہی کب ہیں' جو اسلام کی طرف سے وکیل بن کر آئے ہیں۔ دیکھیے مسلمان علماء کے فتوے یہ سب آپ کی تکفیر میں ہیں۔'' یہ کہا اور میز پر فتوؤں کا ڈھیر لگا دیا۔ مولانا صبر کے ساتھ اپنی تکفیر کا ڈھنڈورا سنتے رہے۔ جب وہ کہہ چکا تو کڑک کر بولے اچھا صاحب میں اب مسلمان ہوتا ہوں اور آپ سب مسلمان گواہ رہیں کہ میں سب کے سامنے کلمہ شہادت پڑھتا ہوں۔ ﴿**اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد عبدہ ورسولہ**﴾ فرمایئے اب تو کوئی عذر باقی نہ رہا۔ مسلمان باغ باغ ہوگئے۔ آریہ مناظر سے جواب نہ بن پڑا اور مولانا نے اپنا کام چلتا کیا۔ (معاصرین: ۱۵۲)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مولانا ثناءاللہ امرتسری مرحوم کی حاضری جوابی اور برجستہ گوئی کے چند واقعات نقل کردیے جائیں۔

مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی رحمۃ اللہ علیہ سیرت ثنائی میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی سکھ لیڈر نے آپ سے پوچھا ''مولانا! بھیڑ اور سور کی شکل وشباہت قریباً ایک جیسی ہے۔ پھر آپ بھیڑ کیوں کھاتے ہیں اور سور سے کیوں نفرت کرتے ہیں.....؟''

یہ سنتے ہی حضرت نے قہقہہ لگایا اور فرمایا سردار

صاحب آپ نے سوال تو بڑا ٹیڑھا کیا ہے' مگر یہ تو کہیے کہ جب آپ بیوی میں اور بہن یا بہو بیٹی میں پوری مشابہت پاتے ہیں تو پھر بیوی کو کیوں حلال سمجھتے ہیں؟ اور ماں بہن یا بہو بیٹی کو کیوں حرام جانتے ہیں؟ سنیے اسلام نے ہمیں بھیڑ کی حلت اور سور کی حرمت کا حکم دے دیا ہے۔ لیکن آپ کے مذہب میں تو یہ صراحت بھی نہیں کہ فلاں کو بیوی بناؤ اور فلاں کو نہ بناؤ۔ سکھ نے یہ جواب سنا تو عرق ندامت کو پونچھتا ہوا چل دیا۔ (صفحہ: ۱۵۰)

ایک بار ایک عیسائی مناظر نے دوران مناظرہ یہ کہا کہ اگر تمہارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے اتنے ہی مقبول ومحبوب تھے تو اپنے لخت جگر حسین رضی اللہ عنہ کو کربلا میں شہید ہوتے دیکھ کر کیوں خدا سے سفارش نہ کی اور کیوں اسے بچا نہ لیا؟

مولانا مرحوم نے بڑی متانت سے فرمایا بھائی کہا تو تھا مگر اللہ میاں نے جواب دیا کہ میرے حبیب میں کیا کروں' میں تو خود اس فکر میں ہوں کہ ظالم عیسائیوں نے میرے اکلوتے بیٹے مسیح کو صلیب پر لٹکا دیا اور میں کچھ نہ کر سکا۔ حسین رضی اللہ عنہ تو پھر بھی تیرا نواسہ ہے۔ یہ جواب سن کر عیسائی مناظر بہت شرمندہ ہوا اور اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ مولانا مرحوم مزید فرمانے لگے پادری صاحب کچھ علم اور عقل کی باتیں کریں' یہ آپ کیا بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔ (صفحہ: ۱۵۹)

ایک بار لاہور میں ایک آریہ مناظر نے بحث کرتے ہوئے طنزاً یہ بات کہ گوشت خوری سے شہوت بڑھتی ہے اور مسلمان چونکہ شہوت پرست ہیں' اس لیے گوشت کھاتے ہیں۔

مولانا نے یہ اعتراض سن کر اس مناظر کو آڑھے ہاتھوں لیا۔ فرمانے لگے پنڈت جی! کچھ سوچ سمجھ کر بولو' مسلمان شہوت پرست ہیں یا آپ......؟ گوشت خور شہوت پرست ہوتا ہے یا دال خور......؟ دیکھو شیر گوشت خور جانور ہے' مگر اپنی مادہ کے پاس صرف ایک ہی بار جاتا ہے' لیکن چڑے چڑیا کو آپ نے دیکھا ہو گا دال خور ہیں' مگر کتنے شہوت ران ہیں۔ مرغ مرغی بھی گوشت خور نہیں ہے۔ آپ کی طرح دال خور ہیں' مگر کتنے شہوت پرست ہیں۔ ابھی مولانا اس طرح کی کچھ اور مثالیں دینا چاہتے تھے کہ پنڈت جی نادم ہو کر بول اٹھے میں اپنے لفظ واپس لیتا ہوں۔ (سیرت ثنائی صفحہ ۱۷۰)

مولانا خادم سوہدروی لکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ ہوا اخبارات میں یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ سب علماء کرام نے مرزا قادیانی پر کفر کا فتویٰ لگا رکھا ہے۔ مگر مولانا ثناء اللہ صاحب نے کفر کا فتویٰ نہیں دیا' نہ اسے کافر کہا ہے۔ مولانا عبدالغنی صاحب خانپوری کا بیان ہے کہ میں یہی اعتراض ذہن میں لے کر مولانا ثناء اللہ صاحب کے پاس پہنچا اور اس کی وجہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا بھئی' میں تو مرزا قادیانی کو کافر کہنا لفظ کفر کی بھی توہین سمجھتا ہوں۔ (سیرت ثنائی صفحہ ۱۷۰)

مولانا ثناء اللہ مرحوم کی حاضر جوابی' برجستہ گوئی' مناظروں کی روئداد اور قادیانیوں کے خلاف تفصیلات کو سیرت ثنائی اور فتنہ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امرتسری میں تفصیل سے دیکھا جاسکتا۔ مولانا امرتسری مرحوم شیریں مقال اور خوش گفتار واعظ تھے۔ وہ دعوت وتبلیغ کے لیے برصغیر کے دور دراز علاقوں میں بھی جاتے تھے اور اپنی مسجد میں جمعہ کا خطبہ بھی ارشاد فرماتے۔ اس کے علاوہ اپنی مسجد میں نماز فجر کے بعد درس قرآن ارشاد فرماتے۔ دوران درس ان کے ہاتھ میں لمبی سی چھڑی ہوتی تھی۔ اگر کسی کو اونگھ آجاتی تو وہ اس سے ہلکا سا چوکا دیتے۔ ان کے دروس اور خطبات جمعہ میں غیر مسلم بھی شریک ہوتے تھے۔ وہ ایک طرف ہو کر بیٹھ جاتے اور توجہ سے مولانا صاحب کے افکار عالیہ سے مستفید ہونے کی کوشش کرتے۔

انہیں کوئی بات پوچھنا ہوتی تو وہ بلا جھجک درس یا خطبہ جمعہ کے بعد پوچھتے اور مولانا بڑی متانت خلوص اور توجہ سے ان کے سوالات کے جواب دیتے۔

مولانا ثناء اللہ مرحوم اونچے مقام ومرتبے کے حامل عالم دین تھے۔ برصغیر کے مذہبی اور سیاسی حلقوں میں انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں کانپور کے جس اجلاس میں ندوۃ العلماء لکھنو کا قیام عمل میں آیا تھا' اس میں مولانا ثناء اللہ امرتسری بھی شامل تھے اور انہیں ندوہ کی کمیٹی میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کمیٹی کے یہ سب سے کم عمر رکن تھے۔

۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلماء ہند کا قیام عمل میں آیا' اس کے محرک اول بھی مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے۔ سیاسی اعتبار سے آپ پہلے کانگرس اور پھر مسلم لیگ کے حامی رہے۔ ۱۹۱۹ء جلیانوالہ باغ کے حادثہ کے بعد مسلم لیگ کا اجلاس مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان کی صدارت میں امرتسر میں منعقد ہوا تھا۔ اس کے صدر مجلس استقبالیہ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ تھے اور انہوں نے اس موقع پر بڑا فصیح وبلیغ اور علمی خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔

(چالیس علمائے اہل حدیث صفحہ ۱۹۲)

جماعتی خدمات

مولانا مرحوم اس خطہ میں دین اسلام کے بہت بڑے داعی' اسلام کے ترجمان اور جماعت اہل حدیث کے حدی خان تھے۔ انہوں نے جماعت اہل حدیث کی شیرازہ بندی اور تعمیر وترقی میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ۱۹۰۶ء میں آرہ میں علمائے اہل حدیث کا ایک اجلاس ہوا تھا۔ مولانا مرحوم بھی شریک مجلس تھے۔ اس موقع پر ہندوستان میں جماعتی صورت حال کا جائزہ لیا گیا اور آخر کافی بحث وتمحیص کے بعد "آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس" کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا عبداللہ غازی پوری کو کانفرنس کا صدر اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کو ناظم اعلیٰ بنایا گیا۔ تشکیل کانفرنس کے بعد حسب قرارداد مولانا ثناء اللہ' مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کی سرکردگی میں اس وفد نے ملک کے طول وعرض میں تبلیغی و تنظیمی دورے کیے۔ اہل حدیث احباب کو جماعتی تنظیم کی اہمیت سے آگاہ کیا اور اہل حدیث انجمنوں کے قیام کی

تحریک دی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ملک میں اہل حدیث انجمنوں کا جال بچھ گیا۔

یہی انجمنیں اس وقت دینی سرگرمیوں کا اہم مرکز قرار پائیں۔ ۱۹۲۰ء میں انجمن اہل حدیث پنجاب کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے روح رواں بھی مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے۔ انہیں اس انجمن کا ناظم اور مولانا عبدالقادر قصوری کو صدر منتخب کیا گیا تھا۔ پنجاب میں انجمن اہلحدیث نہایت فعال تھی اور تبلیغی میدان میں سرگرم عمل آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس کے زیر اہتمام ہر سال کل ہند پیمانے پر سہ روزہ اجلاس ہوا کرتے تھے۔ جسے اس وقت کی ملکی فضا میں تبلیغی حیثیت سے بہت ہی زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ان کل ہند اجلاسوں کے علاوہ صوبائی، ضلعی، علاقائی اور مقامی جلسوں کی بھی ہما ہمی رہتی تھی۔ نشر و اشاعت کا کام بھی اچھے پیمانے پر ہو رہا تھا اور کانفرنس کے ماتحت مبلغین اور واعظین کی ایک ٹیم تھی، جو دین اسلام کی سربلندی کے لیے گردش میں رہتی تھی۔

اس کانفرنس کی بدولت پورے ملک میں جماعت اہل حدیث ایک محور پر گردش کر رہی تھی اور تعمیر و ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس میں مولانا مرحوم کی ذاتی لگن، محنت اور مسلک اہل حدیث سے بے پناہ لگاؤ، خاص اثر رکھتا تھا۔ ان کا ہفت روزہ اہل حدیث جماعت کے ترجمان اور آرگن کا رول ادا کر رہا تھا۔

اکتوبر ۱۹۲۱ء میں مبارک مسجد متصل اسلامیہ کالج لاہور میں جماعت کا ایک نمائندہ اجلاس ہوا۔ اس میں مولانا مرحوم کو جماعت اہل حدیث کا ''سردار'' منتخب کیا گیا اور آپ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی نظامت کے ساتھ ساتھ جماعت اہل حدیث کی سرداری کے منصب پر بھی تاحیات فائز رہے۔ (فتنہ قادیانیت اور ثناء اللہ امرتسری صفحہ ۴۶)

اخلاق و کردار

مولانا ثناء اللہ کو اللہ رب العزت نے بے پناہ اوصاف و کمالات سے بہرہ مند فرمایا تھا۔ وہ شگفتہ تحریریں لکھتے، میٹھی زبان بولتے، بڑے زندہ دل، شگفتہ مزاج، باغ و بہار اور مرنجا مرنج طبیعت کے انسان تھے۔ مہمان نوازی میں مثالی اور اخلاق و کردار میں عالی تھے۔ چھوٹوں پر شفقت فرماتے، بڑوں کا ادب کرتے اور ہم عصر علماء کی تکریم بجالاتے۔ جس قدر ان کا علم وسیع تھا، اسی قدر ان کے ظرف میں بھی وسعت تھی۔

نومبر ۱۹۳۷ء میں قمر بیگ نامی ایک آدمی نے اپنے بریلوی علماء کی باتوں میں آ کر ۱۰۰ شہیدوں کا ثواب کمانے اور حوروں کے لالچ میں آ کر مولانا ثناء اللہ پر تیز دھار گنڈاسے سے قاتلانہ وار کیا۔ مولانا مرحوم اپنے پوتے مولوی رضاء اللہ کے ہمراہ مسجد مبارک کٹڑہ مہان سنگھ امرتسر میں جلسے میں شرکت کے لیے ابھی تانگے سے اترے ہی تھے کہ ان پر حملہ ہو گیا۔ وار اس قدر کاری تھا کہ مولانا کا پگڑی کے نیچے کلاہ کٹ گیا اور سر میں ہڈی تک گہرا زخم آیا۔

مولانا نور توحید کے صفحہ ۵۸ پر لکھتے ہیں باوجود سخت زخم لگنے کے بتصرف الٰہی مجھے کانٹا چبھنے جتنی بھی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ ہاں جسمانی ضعف اس قدر تھا کہ بول نہیں سکتا۔ حملے کے فوراً بعد مولانا یہ فقرہ بار بار دہراتے تھے۔ فی سبیل اللہ ما لقیت۔ دریافت احوال پر فرماتے، اللہ انہیں ہدایت دے۔ فانھم لا یعلمون۔ مولانا مرحوم کئی ہفتے بستر علالت پر رہے اور اللہ نے انہیں صحت یاب کر دیا۔ اب پھر انہوں نے اپنی علمی و تصنیفی اور دیگر جماعتی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ احباب زندگی کی سلامتی پر مبارک دیتے تو فرماتے شہادت کے سارے سامان مہیا ہو گئے تھے، میری کم نصیبی کہ مجھے شہادت میسر نہ ہوئی اور پھر یہ شعر پڑھتے۔

یہ تو قسمت میں کہاں تھا کہ کروں کسب کمال
بے کمالی میں بھی افسوس میں کامل نہ ہوا

ادھر تو یہ صورتحال تھی جبکہ قمر بیگ مولانا مرحوم پر حملہ کرنے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔ جماعت اہل حدیث نے مجرم کو گرفتار کرنے اور اسے قرار واقعی سزا دینے کا پرزور مطالبہ کیا۔ انگریز کا دور حکومت تھا۔ آخر تین ماہ بعد مجرم کلکتہ سے پکڑا گیا۔

۲۷ جنوری ۱۹۳۷ء کو اسے امرتسر لایا گیا اور حکومت کی جانب سے اس پر مقدمہ قائم ہوا۔ ۶ اپریل ۱۹۳۸ء کو عدالت نے اسے چار سال بامشقت کی سزا کا فیصلہ سنا کر اسے جیل بھیج دیا۔ جبکہ مولانا ثناء اللہ مرحوم اس حق میں قطعاً نہ تھے کہ مجرم پر مقدمہ چلایا جائے۔ انہوں نے اپنے اخبار اہل حدیث امرتسر کی ۳ جون ۱۹۳۸ء کی اشاعت کے صفحہ ۱۴ پر لکھا کہ میں سچ کہتا ہوں میں ٹھنڈے مکان میں بجلی کے پنکھے کی ہوا لیتا ہوں، ٹھنڈا پانی پیتا ہوں تو مجھے مجرم کی حالت پر رحم آتا ہے کہ وہ جیل میں کس طرح گزارتا ہوگا۔ خدا اسے توبہ کی توفیق بخشے۔

مولانا مرحوم کا یہ بیان کسی ریاء نمود پر مبنی نہ تھا بلکہ وہ حد درجے رحمدل اور تقویٰ شعار تھے۔ اس موقع پر انہوں نے حسن سلوک کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ اس کی مثالیں کم ہی دیکھنے کو ملیں گی۔ واضح رہے کہ جب قمر بیگ قید ہو گیا تو مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے گھریلو حالات معلوم کرائے تو ان کو پتہ چلا کہ قمر بیگ کے گھر میں کوئی کمانے والا نہیں جو گھر کا خرچہ چلا سکے۔ اب مولانا خفیہ ذرائع سے قمر بیگ کے گھر ۵۰ روپے ہر ماہ بھجوانے لگے۔ جن لوگوں نے قمر بیگ کو وہابی مولوی کو مارنے پر ثواب اور حوروں کی ترغیب دلائی تھی انہوں نے بیگ اور اس کے بیوی بچوں کا احوال تک نہ پوچھا۔ اسے کسی طرح جیل میں ہی مولانا کے حسن سلوک کی خبر لگ گئی تو وہ اپنے کیے پر بہت نادم ہوا۔

جب وہ سزا کاٹ کر جیل سے رہا ہوا تو مولانا مرحوم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے جرم کی معافی مانگی اور مولانا کے اخلاق و کردار سے اتنا متاثر ہوا کہ مسلک اہل حدیث پر عمل پیرا ہو گیا۔

سیرت ثنائی میں لکھا ہے کہ قمر بیگ بھی قیام پاکستان کے بعد سرگودھا آ کر قیام پذیر ہو گیا تھا اور مولانا کی وفات کے بعد روزانہ ان کی قبر پر دعا کے لیے جایا کرتا تھا۔ ہے کوئی ایسا عالم دین جو اپنے مجرم کے گھر والوں کی مالی مدد کرے اور انہیں گھر کے لیے خرچہ دے۔ بلاشبہ مولانا اپنے اعلیٰ حسنِ اخلاق کے باوصف اونچے مقام و مرتبے پر فائز تھے۔ ان کے تعلقات کا دائرہ مسلم اور غیر مسلم حلقوں میں بھی بڑا دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ اپنی خوش روئی اور بلند اخلاق سے بڑے بڑوں کا دل جیت لیتے تھے۔

مسٹر عبدالغفور المعروف غازی محمود دھرم پال جو ۱۹۰۳ء میں آریہ سماج میں چلے گئے تھے اور ۱۹۱۳ء کے لگ بھگ قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۳۰ء) کے ان جوابات کو پڑھ کر جو انہوں نے غازی صاحب کے سوالات پر ان کو دیئے تھے' دوبارہ مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ وہ اس وقت کے اپنے اخبار ''اندر'' کی دسمبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت کے صفحہ ۹۲ پر لکھتے ہیں میری گذشتہ ایک سال کی بے ایذا زندگی نے میرے مسلمان بھائیوں کے دلوں میں بھی میرے لیے اس قدر محبت پیدا کر دی ہے کہ جب ان کو میری بیماری کا حال معلوم ہوا تو وہ جوق در جوق میرے پاس آنے لگے۔ ان میں سے مولوی ثناء اللہ صاحب کا نام خاص کر قابل ذکر ہے۔

مولوی صاحب کے ساتھ تحریری دست پنجہ تو سالہا سال تک ہوتا رہا' مگر روبرو ہونے کا غالباً یہ پہلا ہی موقع تھا۔ جس کو ایک مبارک موقع ہی سمجھنا چاہئے۔ خواہ وہ بیماری کی شکل میں ہی نمودار ہوا ہو۔ مولوی صاحب فطرتاً خوش مذاق اصحاب میں سے ہیں۔ اس لیے سمجھ لینا چاہیے کہ جہاں ایک طرف ''ترک اسلام'' اور ''تہذیب الاسلام'' بلکہ ''نخل اسلام'' کا مصنف بستر مرض پر پڑا ہوا اور دوسری طرف ''ترک اسلام'' اور ''تغلیب اسلام'' بلکہ ''تبر اسلام'' کا مصنف اس کے سرہانے بیٹھا' اس کی تیمارداری کر رہا ہو وہاں اگر ملکوت السموت والارض بھی مسرت سے یہ شعر پڑھ رہے ہوں کہ

شکر ایزد کہ میانِ من واوصلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند

تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس سے پیشتر میرا یہ خیال تھا کہ مولوی ثناء اللہ جو احمدیہ فرقے کے ساتھ ملانوں جیسی فضول چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا ہے۔ وہ ضرور کوئی ''کٹھ ملاں'' ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود ان کے کوشش کرنے کے میں کبھی ان سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن پہلی ہی ملاقات میں مجھے معلوم ہوا کہ مولوی ثناء اللہ ایک خوش مزاج' خوش مذاق' خوبصورت اور خوب سیرت جینٹلمین ہے اور قدرت نے اس کو ایک دلربا ادا دی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس ابن یعقوب کو دیکھ کر مجھے اپنے دل کو تھامنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ وہ ہر تیسرے روز امرتسر سے میری خبر لینے کے لیے لاہور پہنچتے تھے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری کاروباری لحاظ سے بڑے آسودہ حال تھے۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے ثنائی برقی پریس لگایا۔ یہاں ان کے رسائل وکتب بھی شائع ہوتے تھے اور دوسرے لوگوں کی چھپائی کا کام بھی کیا جاتا تھا۔ وہ بڑے فیاض' ہنس مکھ' خوش مزاج' خوش اطوار اور خوش گفتار تھے۔ جس طرح ان کا ظاہر خوبصورت تھا' اسی طرح ان کا باطن بھی خوبصورت تھا۔

عبوست و یبوست سے کوسوں دور رہتے۔ ان کا ادبی ذوق نہایت نکھرا ہوا تھا' اپنی تحریروں' مناظروں' مباحثوں اور تقاریر میں برمحل ایسے اشعار پڑھتے اور علمی لطائف بیان کرتے کہ سامعین وفود مسرت سے جھوم اٹھتے۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب نے ''بزمِ ارجمنداں'' میں مولانا ثناء اللہ مرحوم کے حالات میں لکھا ہے کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری بہت ہی خوش مزاج اور خوش طبع بزرگ تھے۔ ایک دن حاجی محمد اسحاق حنیف نے بتایا کہ امرتسر میں اہل حدیث کی نماز عید کے امام خلیفہ عبدالرحمان تھے' جو زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے' لیکن نہایت پرہیزگار اور متقی بزرگ تھے۔

عید کے موقع پر وہ پنجابی میں تقریر کیا کرتے تھے اور عورتوں کو مخاطب کرتے تو ''او عورتو سنو اور عورتو سنو'' کہا کرتے تھے۔ ایک دن نماز کے بعد عید گاہ سے نکلتے ہوئے چند جوانوں نے انہیں روک لیا اور کہا آپ او عورتو' او عورتو' کہا کرتے ہیں۔ اس کے بجائے ماں بہنو کہا کریں۔ خلیفہ صاحب بقول حاجی محمد اسحاق حنیف بعض الفاظ دو مرتبہ کہا کرتے تھے' نو جوانوں کی بات سن کر بولے ''سیانے دی گل سیانی' سیانے دی گل سیانی'' میں آئندہ ماؤں بہنو! ہی کہا کروں گا۔ اتنے میں مولانا ثناء اللہ امرتسری تشریف لائے اور نو جوانوں سے پوچھا خلیفہ صاحب سے کیا باتیں ہو رہی ہیں' جو بات تھی وہاں انہوں نے بیان کی۔ اس پر مولانا ثناء اللہ امرتسری نے باندازِ مزاح فرمایا تو تم خلیفہ صاحب کو گمراہ کر رہے ہو۔ ان عورتوں میں ان کی بیوی بھی موجود ہوتی ہے۔ یہ ان کو ماؤں بہنوں کیسے کہیں گے' اگر کفارہ دینا پڑے تو کون دے گا......؟

خلیفہ صاحب فوراً بولے ''عالم دی گل توں میں سمجھ گیا جتھے بیوی ہووے اوتھے ماؤں بہنو! نہیں کہنا چاہیدا...... عالم دی گل عالمانہ' عالم دی گل عالمانہ۔'' مولانا امرتسری مسکراتے ہوئے آگے نکل گئے۔

بھٹی صاحب نے بزم ارجمنداں کے کسی دوسرے مضمون میں لکھا ہے کہ جو شخص ایک میٹھا بول نہیں بول سکتا' زبان کو نرمی کے جوہر سے آشنا نہیں کر سکتا' لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور وعظ و تبلیغ میں مخاطب کی ذہنی کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتا' اسے اسلام کی تبلیغ کی بجائے اور کوئی دھندہ اختیار کرنا چاہیے۔

بھٹی صاحب کی یہ تلقین بڑی حکیمانہ ہے۔ اس کے تناظر میں جھانک کر دیکھیں' تو اس کے ہر پہلو میں مولانا امرتسری کی خوبصورت شخصیت کی جھلک دکھائی دے' کی وہ ہمیشہ دوسروں کے مقام و مرتبے کو ملحوظ رکھ کر گفتگو کرتے دوسرے الفاظ میں بہت بڑے مزاج شناس تھے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ساتھ چلتے چلتے ہم بہت دور نکل آئے ہیں۔اب ان کا زندگی کے آخری دور شروع ہوتا ہے۔اس مرحلے پر انہیں کئی بڑے صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔تقسیم ملک کے وقت ہندوؤں اور سکھوں نے آپس میں ملی بھگت سے مسلمانوں کا کھلے بندوں قتلِ عام کیا۔ان کی املاک کو لوٹا بھی اور برباد بھی کیا۔اس کی زد میں مولانا ثناء اللہ مرحوم بھی آ گئے۔سب سے پہلے مولانا مرحوم کا بیٹا مولوی عطاء اللہ جو کہ محلے میں ناگفتہ بہ حالات کے باعث حفاظت پر مامور تھا' اس نے سکھوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش فرمایا۔بوڑھے والد کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ابھی اس کا زخم تازہ ہی تھا کہ بلوائیوں نے مولانا کے کتب خانے کو نذرِ آتش کر دیا۔آپ بے سروسامانی کے حالات میں اپنے اہل خانہ کو لے کر پاکستان کو روانہ ہوئے۔اس وقت ان کی جیب میں صرف پچاس روپے تھے۔

قارئین اندازہ کریں اس شخص پر کیا بیت رہی ہو گی جس کا تمام کاروبار تباہ ہو گیا۔اکلوتا بیٹا بلوائیوں کے ہاتھوں موت کی آغوش میں جا سویا' ہزاروں روپیہ اور طلائی زیورات امرتسر میں ہی رہ گئے۔جس آدمی کا شمار امرتسر کے رؤساء میں ہوتا تھا' وہ اب تہی دست تھا۔اس سب کے باوجود وہ اللہ کی رضا پر راضی تھے۔

مولانا سب سے پہلے لاہور آئے' پھر گوجرانوالہ چلے گئے۔چند ماہ وہاں قیام کر پائے تھے کہ ان کو ضلع سرگودھا میں پریس الاٹ ہو گیا۔چنانچہ پھر انہوں نے سرگودھا میں سکونت اختیار کر لی۔ان کی زندگی کی ابتداء بھی نامساعد حالات اور عسرت سے شروع ہوئی تھی اور اس کا اختتام بھی اسی پر ہوا۔

لیکن زندگی کی ان نیرنگیوں کے باوجود نہ تو انہوں نے کسی کے آگے دستِ سوال دراز کیا اور نہ ہی جھوٹے کلیم داخل کیے۔ہمیشہ اپنے مقام و مرتبے کو بلند رکھا۔احباب نے اگر مجبور کر کے انہیں کچھ دینے کی کوشش بھی کی تو مولانا نے اسے مستحقین میں تقسیم کر دیا۔وہ انتہائی متین و متدین' متقی اور تقویٰ شعار انسان تھے۔مشتبہ چیزوں سے دامن کشاں رہتے تھے۔مولانا مرحوم نے سرگودھا میں قیام پذیر ہو کر نئے عزم و ہمت سے دعوت دین کی شمع کو روشن کرنے کا ارادہ کیا اور اپنے اخبار اہل حدیث کو شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہی تھا کہ ان کی زندگی کی شام ہو گئی۔پے در پے صدمات اور عظیم کتب خانے کی تباہی نے ان کو جسمانی طور پر رنجیدہ و کمزور کر دیا تھا۔

فروری ۱۹۴۸ء میں ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔علاج معالجہ کے بعد ان کی صحت کچھ بہتر ہو گئی۔آخر ۱۵۔مارچ ۱۹۴۸ء کی صبح فرشتہ اجل پروانہ موت لے کر حاضر ہوا اور مولانا زندگی کی ۸۰ بہاریں بھرپور طریقے سے گزار کر فردوس کو روانہ ہوئے۔اس کے ساتھ ہی برصغیر کی علمی' ادبی اور مذہبی تاریخ کے ایک زریں دور کا خاتمہ ہو گیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون

ان کی وفات پر برصغیر کے اخبارات و رسائل اور مشاہیر نے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان سے کچھ اقتباسات نقل کر دیے جائیں۔

عالمِ اسلام کی عظیم شخصیت اور جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر نیپال کے مہتمم مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈا نگری (وفات: ۳۰ نومبر ۱۹۹۹ء) لکھتے ہیں اگر پوری دنیا کے اکابر علماء کسی ایک علمی مجلس میں ہوں اور بیک وقت عیسائیوں' آریوں' سناتن دھرمیوں' قادیانیوں' ملحدوں' شیعوں' منکرین حدیث' بریلویوں غرض ہر فرقہ سے ایک ایک گھنٹہ مسلسل نو گھنٹے بحث و مذاکرہ کی نوبت آئے تو عالمِ اسلام کی طرف سے کون کون ہستیاں ہوں گی۔مجھے نہیں معلوم' لیکن پاکستان' ہندوستان' برما' لنکا' جزائر جاوا و سماٹرا کی طرف سے صرف ایک ہستی پیش پیش ہو گی اور وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ (ندائے مدینہ کانپور شیخ الاسلام نمبر صفحہ ۱۴' طبع: ۱۹۴۹ء)

زمیندار اخبار کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان نے لکھا مولانا ثناء اللہ کی وفات حسرت آیات سے دنیا سے حاضر جوابی ختم ہو گئی۔

اگر رات کو کوئی فرقہ اسلام کے خلاف پیدا ہو جائے تو مولانا ثناء اللہ صبح اس کا جواب دے سکتے ہیں۔ (امام العصر حافظ ابراہیم میر سیالکوٹی)

وہ عالم تھا محدث تھا زمانے کا
وہ ہر میدان کا غازی مجدد تھا زمانے کا
(مولانا نور حسین گرجاکھی)

آپ کو اگر خاتم المناظرین بھی کہہ دیا جائے تو شاید نامناسب نہ ہو گا۔(مولانا عبدالمجید سوہدروی)

مولانا ثناء اللہ برصغیر ہند میں اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے وکیل ہیں۔(علامہ رشید رضا مصری)

حضرت ابوالوفاء کی کتاب زندگی کے اوراق ملک کے گوشے گوشے میں بکھرے ہوئے ہیں۔(امام خاں نوشہروی)

اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس نے بھی زبان کھولی اور قلم اٹھایا' ان کے حملے کو روکنے کے لیے ان کا قلم شمشیر بے نیام ہوتا تھا اور اسی مجاہدانہ خدمت میں انہوں نے عمر بسر کر دی۔مرحوم اسلام کے بڑے مجاہد سپاہی تھے۔زبان اور قلم سے اسلام پر جس نے بھی حملہ کیا' اس کی مدافعت میں جو سپاہی سب سے آگے بڑھتا وہ وہی (مولانا ثناء اللہ) ہوتے۔اللہ تعالیٰ اس غازی اسلام کو شہادت کے درجات و مراتب عطا فرمائے۔آمین۔(سید سلیمان ندوی یادِ رفتگاں صفحہ ۳۷۳)

یہ ایک ہلکی سی جھلک ہے۔مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے لیل و نہار کی جو انہوں نے اسلام کی نشر و اشاعت اور مسلک اہل حدیث کے فروغ میں بسر کیے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے نام اور کام سے آج ایک دنیا آگاہ ہے۔جس طرح ان کی دینی' تبلیغی' تصنیفی اور اسلام کے دفاع کے لیے مناظرانہ سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہے۔اسی طرح ان کی حسنات کی فہرست بھی طویل ہے۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔آمین یارب العالمین۔